ڈاکٹر بدرالدین بٹ

عربی ادب کا ارتقا

لفظ "ادب" کی اصل کیا ہے اور یہ موجودہ اصطلاحی معنی میں کب استعمال ہونے لگا، اس سلسلے میں محققین کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ عمدہ مفہوم رکھنے اور سہل و آسان ہونے کے باوجود یہ لفظ نہ تو قرآن میں مذکور ہے اور نہ جاہلی شعرا کے کلام میں ان اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس وقت دورِ جاہلی کی جو عبارتیں یا اشعار ہمارے سامنے موجود ہیں ان میں اوّل تو یہ لفظ ان اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہی نہیں اور اگر استعمال ہوا بھی ہے تو ان عبارات اور اشعار کی حیثیت محققین کے نزدیک غیر مستند اور مشکوک ہے۔ مرحوم ڈاکٹر طٰہٰ حسین بے دھڑک کہتے ہیں کہ "مجھے جاہلی ادب کے بارے میں تردد اور شک رہا اور میں برابر اپنے شک پر اصرار کرتا رہا یا یوں کہیے کہ شک برابر میرے ساتھ رہنے پر مصر رہا۔ یہاں تک کہ میں نے تفکر اور رغبت و تلاش سے کام لینا شروع کیا، جس کے بعد میں ایسی حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جو اگر یقینی نہیں تو یقین کی حد تک ضرور پہنچی ہوئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آج تک جس کو ہم جاہلی ادب کہتے رہے ہیں اس کے اکثر و بیشتر حصے کا جاہلی ادب سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ ظہورِ اسلام کے بعد بڑھایا گیا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ علما کو "ادب" کی اصل کے متعلق بڑے ترددات اور تاویلات سے کام لینا پڑتا ہے۔ مشہور اطالوی پروفیسر نالینو کی ادب کے اشتقاق کے بارے میں ایک خاص رائے ہے۔ وہ "ادب" کو "دأب" بہ معنی عادت سے مشتق مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "ادب" مفرد سے نہیں بلکہ "دأب" کی جمع سے نکلا ہے۔ "دأب" کی جمع "ادآب" ہے جو تبدیل ہو کر آداب ہو گئی ہے، جس طرح "بئر" اور "رئم" کی جمع "آبار" اور "ارآم" سے بدل کر "آبار" اور "آرام" ہو گئی ہے۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ "دأب" کی جمع "آداب" کا استعمال اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اہلِ عرب اس جمع کی اصل کو اور جو اس میں تبدیلی ہوئی ہے اس کو بھول گئے اور ان کو یہ غلط خیال پیدا ہو گیا کہ "آداب" ایسی جمع ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے اور اسی جمع سے انھوں نے اس کا واحد بجائے "دأب" کے "ادب" سے سمجھا اور ادب کا عادت کے معنوں میں استعمال عام طور پر ہونے لگا۔ اس

کے بعد یہ لفظ اپنے خاص معنی سے دوسرے مختلف معنوں میں منتقل ہوتا رہا۔

احمد حسن الزیات کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی اور دیگر سامی زبانوں میں سریانی زبان سے داخل ہوا ہے۔ ان لوگ پرانے زمانے سے جنوبی عراق میں آباد تھے۔ سریانیوں سے یہ سامیوں نے لیا جو ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ اس لفظ کے معنی ان کے پاس انسان کے تھے۔ شاید بعد میں یعنی "ادب" سے "آدم" ہو گیا، پھر عربی زبان نے اس کو اپنی مساوی اصل ہی میں محفوظ کیا اور ان معنوں میں استعمال کیا جن سے "آدمیت" یا "انسانیت" کے معنی مراد لیے جا سکتے تھے۔ وہ آدمیت جس میں خصائل حمیدہ یا اس سے قریب تر صفات ہوں۔

مگر احمد الشائب کا خیال ہے کہ "دو ظاہری وجوہ کی بنا پر غالباً لفظ "ادب" عربی ہی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسے الفاظ جو "ادب" سے معنی کے اعتبار سے اور مادے کے اعتبار سے قریب ہیں پائے جاتے ہیں مثلاً "بدأ آبدا"، "دأب" کو پیش کیا جا سکتا ہے اور یہ سب کسی چیز کے ساتھ تعلق کے معنی میں مشترک ہیں اور یہ بہت ہی عجیب اور نادر بات ہے کہ لفظ "ادب" اپنے ہلکے پن اور اپنے معنی کے باوجود بھی ان مشترک المعنی الفاظ کے ساتھ کتابوں نہیں ملتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسری سامی زبانوں مثلاً سریانی اور عبرانی میں بھی یہ موجود نہیں۔ ان زبانوں کا تعلق عربی زبان سے بہن کا سا ہے، پس یہ بات مسلم ہے کہ یہ لفظ خارجی نہیں بلکہ عربی الاصل ہے۔"

ان تاویلات اور مفروضات کو پیش کرنے کے بعد آئیے اب "ادب" کے تدریجی ارتقا کے بارے میں کچھ گفتگو کریں۔

دورِ جاہلیت

عربی ادب کی کتابوں میں ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ "ادب" کا لفظ دورِ جاہلیت میں مستعمل اور رائج تھا۔ ابن عبد ربہ نے نعمان بن منذر کا ایک خط نقل کیا ہے جو اس نے کسریٰ کو ارسال کیا تھا۔ اس خط میں یہ الفاظ بھی ہیں: "وقد اوفدت ایہا الملک رهطاً من العرب لہم فضل فی احسابہم وانسابہم وعقولہم وآدابہم۔"

اسی طرح "العقد الفرید" ہی میں ذکر ہے کہ عتبہ بن ربیعہ نے اپنی بیٹی کے ہونے والے شوہر ابوسفیان کا نام لیے بغیر اس کی خوبیاں شمار کرتے ہوئے کہا: "بدر ارومتہ وعز عشیرتہ یؤدب اہلہ

ولا يُؤدِّبُونَه " (یعنی وہ اپنے خاندان کو بچاتا اور عزت دیتا ہے اور انہیں ادب سکھاتا ہے، وہ ان سے ادب نہیں سیکھتے)۔ جنہوں نے جواباً کہا "إنی مساختہ وبأدب البعل" (یعنی میں اس کا ادب شوہر کا سا کروں)

علقمہ بن علاثہ کی وہ باتیں بھی قابل غور ہیں جو اس نے کسریٰ کے سامنے کی ہیں، جن میں اس نے "فليس منهم أحد إلا وهو يرى أنه أفضل من غيره عندك، بل لو قست كل رجل منهم إلى منهم ما علمنا لوجدت له في آبائه أنداداً وأكفاءً كلهم إلى الفضل منسوب وبالشرف والسؤدد موصوف وبالسخاء والفضل والأدب معروف" (یعنی وہ جو سب وہ ہیں، وہ کم تر نہیں ہیں ان سے جو تمہارے سامنے حاضر ہوئے ہیں ..... تو تم سب کو فضل و اور سرداری کے شرف میں شریک پاؤ گے اور فاضل اسے ادب سے معروف و موصوف پاؤ گے)۔

دورِ رسالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عہد میں یہ لفظ ثقافت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اصطلاحی معنی کے بالکل قریب ہے۔ ثبوت کے طور پر تین حدیثوں کو ہم پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت علی نے آنحضرت سے پوچھا: "یا رسول اللہ ہم تو ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں، ہم آپ کو مختلف وفود عرب سے گفتگو فرماتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر اس کا اکثر حصہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے" آنحضرت نے جواباً فرمایا: "أدبني ربي فأحسن تأديبي وربيت في بني سعد" (یعنی میرے پروردگار نے میری تربیت (تادیب) کی اور بہت اچھی تادیب کی اور میری پرورش بنی سعد میں ہوئی ہے)۔

اسی طرح عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إن هذا القرآن مأدبة الله في الأرض فتعلموا من مأدبته" پس "ادب" اسم مکان ہے جو حدیث میں بطور تشبیہ استعمال ہوا ہے۔ قرآن وہ آداب بیان کرتا ہے جن کی طرف اللہ اپنے بندوں کو بلاتا ہے، وہ ادب کو کریمانہ اخلاق، بہترین دانائی، منفعت بخش نصائح اور ہر وہ چیز ہے جس سے نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ اسی طرح حضرت علی کا قول ہے: "وأمّا إخواننا بنو أمية فقادة أدبة" یہاں "ادبة"، "ادب" کی جمع ہے، جس طرح کاتب کی جمع "کتبة" ہے اور "ادب" دسترخوان کی طرف بلاتا ہے اور وہ کھانا ہے جس کو آدمی بناتا ہے اور پھر لوگوں کو اس طرف بلوکر کھلاتا ہے۔ بعض علما کی رائے کے مطابق اس ثقافت کی یہ پہلی لغوی اصل ہے

اور ہم محققین کو اس بات پر متفق پاتے ہیں کہ یہ ایسے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ یہ لفظ بدو میں نہیں آیا ہے۔

اموی دور

اموی دور آیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کلمہ صحیح طور پر تاریخ میں داخل ہوتا ہے اور یہ ایک کثیر الاستعمال کلمہ بن جاتا ہے۔ اس کے مشتقات بڑھ جاتے ہیں۔ بقول طٰہٰ حسین " بہرحال اس کی اصل کچھ ہی کیوں نہ ہو اور اس لفظ کا مصدر کچھ بھی ہو، اتنا تو طے شدہ ہے کہ بنوامیہ کے دور میں اس لفظ کا اطلاق اس قسم کے علم پر ہوتا تھا جس کا کوئی تعلق مذہب و دینیات سے نہ ہو یعنی شعر و شاعری (جس میں فحش اور ہاجی بھی شامل ہیں جو اس دور میں جریر، فرزدق اور اخطل کے درمیان چل رہی تھیں حالاں کہ یہ سب دین و اخلاق کی رو سے غلط، گناہ اور منکر وہ ہیں) کہانیاں اور وہ ضمنی علوم جو شعر اور کہانیوں سے متعلق ہیں۔ نیز یہ لفظ ان چیزوں پر بھی دلالت کرتا تھا جن کو آج روزمرہ کی عملی زندگی میں ہم اس لفظ سے مراد لیتے ہیں۔ یعنی نیک نفسی، شرافت، حسن اخلاق اور وہ سیدھی سادی زندگی جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ عام طور پر وہ بہتر زندگی ہے۔ لوگ کہتے تھے " ادب فلانا " اور اس سے یہ دونوں معنی مراد لیتے تھے۔ فلاں شخص کو اس نے ادب کی تعلیم دی، اس خاص قسم کی تعلیم جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ دوسرے معنی اس کو ادب اور تہذیب سکھائی، وہ طرز زندگی جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ ادب کا لفظ انہی دونوں معنوں میں تاریخ عربی کے ہر دور میں دلالت کرتا رہا ہے۔ خود ان معنوں نے بہت سی کروٹیں بدلیں۔ کبھی اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی اور کبھی یہ انتہائی محدود رہا مگر " ادب " کا لفظ دونوں حالتوں میں انہی دو معنوں کے ساتھ چلتا رہا۔" اسی طرح طٰہٰ حسین ایک اور جگہ رقم طراز ہیں " اگر آپ وہ عبارتیں پڑھیں گے جن میں اس مادے کا استعمال دور بنی امیہ میں ہوا ہے تو آپ قطعی طور سے محسوس کریں گے کہ سب سے پہلے جس مفہوم میں اس کا استعمال ہوا ہے وہ تعلیم ہے۔ تعلیم کا وہی مفہوم جو بنی امیہ کے زمانے میں اس لفظ سے سمجھا جاتا تھا، یعنی روایت کے ذریعے پڑھانا۔ شعر کی روایت، حدیثوں کی روایات، پہلے لوگوں کے واقعات اور ان کے کارناموں کی اور ہر اس چیز کی روایت جس کا تعلق دور جاہلیت سے ہے۔ نئے اور پرانے لوگوں کی بہادری کی داستانوں کی اور ہر اس چیز کی روایت جو اس ثقافت کی تشکیل میں معاون ہے، جس کا ہر روشن خیال عرب متمنی تھا، یعنی وہ لوگ جن کے ہاتھ میں طاقت تھی یا

وہ اطاعت جس کا خلفائے وقت احترام کرتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مادہ شروع شروع میں فعل یا اسم فاعل کی صورت میں استعمال ہوتا تھا۔ اہل عرب اُدَب کا صیغہ استعمال کرتے تھے یا ایک خاص مفہوم میں "مؤدب" کا لفظ ہر قسم کی روایت کرنے والوں کے لیے نہیں بولا جاتا تھا۔ حدیث کے راویوں یا مذہبی علوم کے پڑھانے والوں کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اشعار کے راویوں پر، تاریخی واقعات بیان کرنے والوں پر اور ان لوگوں پر جو امرائے وقت کے بچوں کو اشعار و اخبار کی تعلیم دینے کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے، ان پر اسی لفظ کا اطلاق ہوتا تھا، جیسا کہ ابو معبد الجہنی اور عامر الشعبی تھے۔ یہ دونوں عبد الملک بن مروان کی اولاد کو تعلیم دیتے تھے اور صالح بن کیسان، عمر بن عبد العزیز کے بیٹے کے مؤدب تھے اور آخری اموی حکمران مروان بن محمد کا مؤدب جعد بن درہم تھا۔

اوپر کی باتوں کا ثبوت ان تحریروں سے ملتا ہے جو اس دور کی طرف منسوب ہیں۔ ہم زیاد کے "خطبہ البتیرا" کا اقتباس نقل کرتے ہیں: "فادعوا الله بالصلاح لائمتکم فانهم ساستکم المؤدبون لکم ...... اما والله لأؤدبنکم غیر هذا الادب او لتستقیمن" (یعنی خدا کو اپنے اماموں کی اصلاح کے لیے پکارو کیوں کہ وہ تمھارے سردار ہیں جو آپ کے مؤدب ہیں، نہیں تو بخدا! میں اس ادب کے بدلے دوسرا ادب سکھاؤں گا جب تک نہ سدھر جاؤ گے)۔

یہاں یہ بالکل واضح ہے کہ مادہ اس کے تہذیبی معنوں میں مستعمل ہے جو اخلاق فاضلہ اور نیک سلوک کے قریب ہے۔ اسی طرح عمر بن عبد العزیز نے اپنے مؤدب سے پوچھا: کیف کانت طاعتی ایاک وانت تؤدبنی" تو مؤدب نے جواب دیا: "اچھی اطاعت" تو عمر نے فرمایا: فأطعنی الآن کما کنت اطیعک (یعنی میری پیروی کرو جس طرح میں آپ کی اطاعت کرتا تھا)۔

پہلی صدی ہجری کے وسط سے مادہ "ادب" کے تہذیبی معنی کی تحدید ہوئی اور یہ دو ممتاز معنی ادا کرنے لگا۔ ایک اخلاقی اور تہذیبی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو مشق کے ذریعے اجتماعی فضائل اور خصائل کریمانہ مثلاً بردباری، کرم، شجاعت اور سچائی پر ابھارا اور آمادہ کیا جائے اور پھر اس مشق کے ذریعے لوگوں میں بھی اخلاقِ فاضلہ اور سیرتِ حمیدہ کا تاثر پیدا کیا جائے اور اسی وجہ سے ابن المقفع نے اپنی کتابوں کا نام "الادب الصغیر" اور "الادب الکبیر" رکھا۔ (اگرچہ قبل الذکر کی صحت نسبت بہت مشتبہ ہے) کیوں ان میں ایسے قوانین اور اصول تھے کہ جو ان کا پابند ہو گیا

ادیب، فاضل یا مودب بن گیا اور جس کی سیرت محمودہ اور اخلاق کریمانہ ہو وہ بھی

دوسرے معنی تعلیمی ہیں جو شعر و نثر کی روایت اور انساب و اخبار اور امثال اور ایسے علوم پر عام ہے جن سے عقل منور، ذوق پاکیزہ، نفس مہذب اور عرفان سے سرشار ہو جاتے۔ لہذا جن علوم سے ادبی ثقافت کی [illegible] دوسرے سے ممتاز ہو گئے۔ مذکورہ بالا معانی کی طرف انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار ایف جبرائیلی نے اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ جبرائیلی رقمطراز ہیں:

"However from the first Century of the Hidjra, adab in addition to its ethical and social meaning acquired an intellectual meaning, which was at first connected with first meaning, but then became increasingly differentiated from it. Adab came to imply the sum of knowledge which makes a man courteous and "Urbane" profane, Culture (as distinct from "ilm" or other religious learning "Koran", hadith and Fikh) based in first place on poetry, the art of oratory, the historical and tribal traditions of the ancient Arabs and also of corresponding sciences rhetoric, grammar, lexicography metrics."

یہی وجہ ہے کہ ادب کا یہ انسانی تصور ابتداً خالصتاً قومی تھا۔ چنانچہ بنو امیہ کے دور میں مکمل ادیب وہ شخص تھا جو شعرائے قدیم، ایام العرب اور عرب ثقافت کے شاعرانہ، تاریخی اور پاستانی پہلوؤں سے بہترین واقفیت رکھتا ہو۔ لیکن غیر ملکی ثقافتوں کے ساتھ رابطہ پیدا ہو جانے پر لفظ "ادب" کا مفہوم وسیع تر ہو گیا اور عرب ادبیات کی جگہ اب مطلق و بلا قید ادبیات نے لی۔ اب اس کے مفہوم میں غیر عربی ادب (ہندی، ایرانی اور یونانی) اقوال و امثال سا گئے۔

فنی ادب) کے ان عناصر کا علم بھی شامل ہو گیا جن سے عربی اسلامی ثقافت ابتدا [illegible] دور اور اس کے بعد واقف ہوئی۔ اسی عہد سے ادیب یا مؤدب، شاعر و کاتب سے ممتاز ہو گیا۔ جس آدمی پر ادب تعلیم کا غلبہ ہو وہ ادیب ہو گیا اور جب اس پر جذبۂ شاعری غالب ہو تو شاعر بن گیا اور جب نثر نویسی کا غلبہ ہو تو کاتب کہلانے لگا۔

مادہ "ادب" پہلی صدی ہجری کے ان ہی دو معنوں پر دلالت کرتا رہا، اس میں رد و بدل بھی ہوا۔ اس کے معنی میں کبھی تنگی اور وسعت آتی گئی لیکن یہ دو معنی سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ مراد لیے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا "ادب دو ہیں، ایک ادب النفس، دوسرا ادب الدرس۔

عباسی دور

جب دوسری صدی ہجری کا نصف زمانہ گزر گیا اور عربی علوم یعنی لغت، صرف و نحو پروان چڑھے تو ادب کے تعلیمی معنی میں اضافہ ہو گیا اور اس میں کچھ وسعت پیدا ہو گئی اور یہ کلمہ منقول نثر و نظم اور انساب و اخبار، صرف و نحو اور لغت و تنقید پر دلالت کرنے لگا لیکن ایسی صورت حال زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔

بے شک عصرِ عباسی ایک انقلابی دور تھا۔ اس میں علومِ عربیہ نے ٹھوس شکل اختیار کی، سماجی حالات میں تبدیلی ہوئی، تہذیبی زاویوں کی رنگا رنگی نے وہ صورتِ حال پیدا کی جس سے تیسری صدی ہجری کے اواخر میں "ادب" مندرجہ ذیل معنی ادا کرنے لگا۔

۱۔ ادب اپنے صحیح یا خاص معنی کے اعتبار سے نام ہو گیا ان چیزوں کا جو از قسم نثر و نظم روایت کی جاتی ہیں اور ان علوم کا جو نثر و نظم کے ساتھ تشریح و تفسیر اور فنی خوبیوں کی طرف رہنمائی کرتے اور تعلق رکھتے تھے۔ یہ علوم جو اس قسم کا اتصال اور تعلق نظم و نثر کے ساتھ رکھتے ہیں لغت، نحو، انساب، اخبار اور کبھی کبھی تنقید کے ناموں سے یاد کیے جاتے تھے اور یہ معنی قریب ہیں اس معنی کے جو ادب پہلی صدی ہجری میں ادا کر رہا تھا، بلاشبہ اس میں فنی نثر اور تنقید کا اضافہ ہو گیا۔

تیسری صدی ہجری میں جو ادبی تالیفات معرضِ وجود میں آئی ہیں وہ اس معنی کی تصدیق بھی کر رہی ہیں اور تفسیر بھی۔ مثال کے طور پر ہم جاحظ کی "البیان والتبیین"، ابن قتیبہ کی "الشعر والشعراء"، المبرد کی "الکامل"، محمد بن سلام کی "طبقات الشعراء" کو پیش کر سکتے ہیں، گو بقول

طرح سے ان یہ کتابیں کسی نظام اور اصول کے تحت نہیں لکھی گئی ہیں، مگر ہم لغوی مسائل، نحوی آراء تنقیدی خیالات اور قصصی علوم کے ساتھ ساتھ ان میں خالص ادب بھی پا سکتے ہیں۔

۲۔ دوسرے معنی عام ہیں، اس میں وہ تمام علوم انسانی، علمی آثار اور فنون جمیلہ اور ریاضی شامل ہیں جن سے ثقافتِ انسانی میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور آدمی ایک اعلیٰ معیار اور مہارتِ تامہ حاصل کرتا ہے۔ حسن بن سہل نے کہا ہے کہ آداب دس ہیں۔ تین شہرجانی، تین نوشیروانی اور تین عربی، اور ایک سب کا نچوڑ ہے۔ اب جہاں تک سارنگی، شطرنج اور لاٹھی کے کھیل کا تعلق ہے یہ سب شہرجانی ہیں اور طب، انجنیئرنگ اور شہ سواری نوشیروانیہ ہیں اور عربی آداب میں شعر و نثر انساب و احب شامل ہیں جہاں تک ایک کا سوال ہے تو اس میں منتخب باتیں اور کہانیاں اور وہ چیزیں شامل ہیں جو مجالس میں لوگ ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔ اس سے ان معاشرتی اور تہذیبی اثرات کی مقدار واضح ہوتی ہے جنھیں ایرانیوں نے نئی اسلامی زندگی میں سرایت کر دیا۔

ایف جبرائیلی کا کہنا ہے کہ تیسری صدی کا ادیب جس کی مکمل ترین مثال الجاحظ تھا، نہ صرف عربی نثر اور شعرِ عرب، امثالِ عرب، ایام العرب، جاہلیت اور عربوں کے اس زمانے کے انساب اور روایات کا ماہر تھا جب تمدنِ اسلامی ان میں راسخ نہ ہوا تھا بلکہ اس کی علمی دلچسپی کے دائرے میں پورا عالمِ ایران مع اپنی رزمیہ اخلاقی و قصصی روایات کے سما گیا تھا، اسی طرح ساری دنیائے ہند اپنی اساطیر و داستانوں سمیت اور سارا جہان یونان اپنے عملی فلسفے خصوصاً اخلاقیات و اقتصادیات کے ساتھ۔

اس طرح تیسری صدی ہجری میں جو ادبی تصانیف وجود میں آئیں جن کا تبحر علمی گوناگوں بھی تھا اور دل خوش کن بھی، ان سب تصانیف کو خالصتاً علمی بھی نہیں کہا جا سکتا، اگرچہ بعض اوقات وہ علمی منہج کے قریب پہنچ جاتی ہیں اور انھیں استعمال بھی کرتی ہیں، بلکہ ان کا مرکز اوّلین انسان، اس کی صفات و جذبات، وہ ماحول جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے اور وہ مادی و روحانی ثقافت ہے جو اس نے تخلیق کی۔ اسی دائرے میں رہ کر الجاحظ اور اس کے متبعین (التوحیدی۔ التنوخی) نے اس ورثے سے جو ایرانی الاصل عبقری ابن المقفع نے گزشتہ صدی میں دنیائے اسلام کے لیے چھوڑا تھا، نہ صرف پورا فائدہ اٹھایا، اسے وسعت بھی دی۔ حقیقت میں المقفع ہی کو ادب کے اس وسیع تر تصور کا اوّلین پیش کرنے والا کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس نے غیر ملکی تاریخی اور ادبی ذخائر (خدائے نامک اور کلیلہ و دمنہ

کو عربی سانچے میں ڈھالا اور اخلاقی پند و نصیحت کے لیے رسائل "الادب الکبیر" اور "الادب الصغیر" لکھے (اگرچہ موخر الذکر رسالے کی صحت نسبت مشکوک ہے) ان ادبی تخلیقات کو عباسی عہد کی ثقافتی بلندی کی حقیقی بنیادی قوت سمجھنا چاہیے۔

تیسرے معنی یہ ہیں کہ اس میں وہ ادبی علوم بھی شامل ہیں جو مستقل بالذات ہو گئے اور خالص ادب سے علیحدہ ہو گئے۔ گویہ ایک ادیب کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان علوم سے اپنی ثقافت کی تکمیل کرے اور انشائے ادب کے لیے ان علوم سے استمداد کرے اور اپنی فہم اور قوتِ نقد کو بڑھانے میں ان سے مدد لے۔ یہ علوم لغت، نحو، انساب و اخبار اور تنقید تھے اور یہی وہ علوم تھے جو ثقافتِ عربی کے ستون تھے۔ اسی ثقافتِ عربی کے ساتھ ساتھ ثقافتِ دینی بھی ابھر کر سامنے آئی اور تفسیرِ قرآن، علوم حدیث، فقہ اور اس کے اصول، علم کلام مثلاً توحید اور اس کے دیگر مذاہب کی بحثیں بڑھ گئیں اور ان علوم میں ثقافت کا وہ فلسفہ بھی تھا جو اصل میں ہندوستان، ایران اور یونان سے منتقل ہو گیا تھا۔

چوتھے معنی ادب النفس کے تھے اور ادب کے یہ مفہوم و معانی وسیع ہو گئے۔ اس میں مستحسن اسلوب، علم و عمل میں اخلاق فاضلہ اور سیرتِ محمودہ کی جلوہ گری اور وہ قوانین جو ہر منصب دار یا حرفت والے کے لیے ضروری تھے، شامل تھے۔ مثلاً ایک "ادب الکاتب" کہلانے لگا یعنی وہ ادب جو کاتب کے عہدے پر مامور ہونے کے لیے درکار ہو یا اسی طرح "ادب یا آداب الوزرا" یعنی مخصوص علم و تجربہ کا وہ مجموعہ جو فرائض وزارت کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے، اس طرح کی کتابوں کے لیے امام ابو یوسف کی "ادب القاضی"، ابن قتیبہ کی "ادب القراءۃ" وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ادب کے لغوی علوم مستقل طور پر جدا ہو گئے اور تنقید باقی رہی۔ اس صدی میں تنقید میں ترقی ہوئی اور ایک بلند درجہ حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ مستقل بالذات ہو جائے۔ اس زمانے میں جو کتابیں اس مقصد کے لیے تالیف کی گئیں ان میں ابو ہلال عسکری، ابو الحسن جرجانی اور آمدی کی تصانیف سب سے واضح مثالیں ہیں۔

چوتھی صدی ہجری ہی میں بحتری کے طرف داروں اور ابو تمام کے طرف داروں کے درمیان سخت قسم کا اختلاف ہوا اور اسی صدی میں آگے بڑھ کر متنبی کے حامیوں اور اس کے مخالفوں کے درمیان شدید اختلافات کی وجہ سے ٹھن گئی تھی۔ اس اختلاف نے فنِ تنقید کو فائدہ پہنچایا۔ آمدی نے ایک

ب " الموازنة بین الطائیین "، لکھی اور جرجانی نے " الوساطة بین المتنبی وخصومه " تالیف کی۔ پانچویں صدی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ عبد القاہر جرجانی جیسے زبردست استاد " دلائل الاعجاز " " اسرار البلاغة " لے کر نمودار ہوتے۔ ان کے معنی یہ ہیں کہ ادب نے اپنے خاص معنی میں بلاغت کو بھی چھوڑ دیا اور صرف شعر و نثر میں محدود ہو گیا۔ اسی طرح جب کبھی کوئی علم پختہ ہوتا گیا، فنِ ادب کو چھوڑتے ہوئے مستقل ہوتا گیا اور ادب " قول ماثور " کے گرد گھومتا رہا۔ دوسرے الفاظ میں " ادب کا وہ وسیع انسانی مفہوم جو اسے خلافت کے ابتدائی زمانے میں حاصل رہا تھا ختم ہو گیا اور ادبِ لطیف (Belles Letters) کے تنگ تر اور زیادہ بلیغانہ حلقے میں محدود و مقید ہو گیا۔ پس ادب کا اطلاق محض شعر و سخن، نثرِ مرصع (Pareneography) اور حکایات و نوادر نگاری پر ہونے لگا۔ ادب کی یہی وہ قسم تھی جس میں الحریری نے اپنی لفظی صنعت گری اور حد درجہ متکلف اندازِ بیان اور کلمات کے صحیح استعمال کے شوق کی بدولت مہارتِ تامہ حاصل کر لی تھی۔ ادب انسانی (Literature of Humanities) سے ادب اب صرف ادب فرہنگی یا دبستانی (Academy) بن کر رہ گیا "۔ یہ تو ادب کے خاص معنی کی بات تھی، اب جہاں تک عام معنی کا تعلق ہے تو وہ اپنی وسعت کے مطابق عقلی آثار، شرع، فلسفہ وغیرہ کے امور پر حاوی رہا۔

عصرِ حاضر

عصرِ حاضر میں ادب اور اس سے بھی زیادہ اس کی جمع آداب، اس لفظ کے مخصوص ترین مفہوم میں لٹریچر کے مترادف ہے۔ چنانچہ " تاریخ الادب العربیہ " سے مراد عربی ادبیات کی تاریخ اور " کلیة الآداب " ان یونیورسٹیوں میں جن کی تنظیم یورپی طرز پر ہوئی ہے، فیکلٹی آف آرٹس یا لیٹرز کے مترادف ہے لیکن اس اصطلاحی نام کی حدود سے باہر بعض ادیبوں کے بالارادہ استعمال سے اس لفظ کے مفہوم کو اس کی پہلی سی وسعت اور لچک دینے کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں مرحوم طہٰ حسین کے خیالات قابلِ غور ہیں۔ چنانچہ الادب الجاہلی میں وہ لکھتے ہیں کہ " ادب اس کے حد سے اور اپنی اصل کے اعتبار سے کلامِ منقول کے آگے نہیں جاتا۔ یہاں ایک اہم اور متضادی اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ آپ کسی شاعر یا ادیب کے ادبیات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اگر آپ نے صرف انہی علوم کا سہارا لیا ہے جن سے سہارا لینے کے ہم لوگ عادی ہیں، یعنی علم لغت، علم الانساب،

علم الاعراب، علم النقد۔ اس سلسلے میں آپ کو چند ایسے علوم کا سہارا بھی لینا ہے جن کا بظاہر ادب سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ مثال کے طور پر عربی شاعر متنبی یا معری کو ہم پیش کرتے ہیں۔ آپ نحو، لغت، انساب اور تاریخ سے ہی واقف کیوں نہ ہوں۔ آپ علوم معانی، بیان و بدائع پر دنیا بھر سے زیادہ قدرت اور مہارت کیوں نہ رکھتے ہوں۔ یہ چیزیں آپ کے لیے متنبی یا معری کے اشعار سمجھنے میں کافی نہ ہوں گی۔ نفسیاتِ انسانی کا مطالعہ ضروری ہوگا تاکہ آپ متنبی کے اشعار سمجھ سکیں۔ طبیعیات، مابعد الطبیعیات، ہیئت، نجوم یہاں تک کہ ریاضی تک سے واقفیت ضروری ہوگی تاکہ آپ معری کا کلام سمجھ سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب ہم ادب کی تعریف کلامِ منقول اور علوم متعلقہ سے کرتے ہیں تو یا تو کچھ کہتے نہیں ہیں یا سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔ جب علوم متعلقہ سے ہم صرف علوم لغات مراد لیتے ہیں تو گویا ہم سب کچھ نہیں کہتے۔ اس لیے کہ آپ کو بخوبی اندازہ ہوا ہوگا کہ شعر کے یا نثر کے سمجھنے میں اور اس سے لطف اندوز ہونے میں صرف انہی علوم سے واقفیت کافی نہیں ہے تو اہلِ منطق کی اصطلاح میں تعریف جامع نہیں ہے۔

اگر علوم متعلقہ سے ہم ہر وہ علم مراد لیتے ہیں جس کی ضرورت پڑ سکتی ہے تو گویا ہم سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اسی لیے متنبی اور معری کے اشعار سمجھنے میں فلسفے اور اس کی مختلف قسموں سے واقفیت کا علم، ہم اوپر تذکرہ کر چکے ہیں اس بارے میں تو کیا، معری کے مطالعے میں آپ کے لیے نہ صرف تمام علوم اسلامیہ سے واقفیت ضروری ہوگی بلکہ نصرانیت، یہودیت اور برصغیر پاک و ہند کے تمام ادیان و مذاہب کا علم بھی لازمی ہوگا، اس طرح تمام علوم و فنون ادب میں داخل ہو جائیں گے اور اصطلاح منطق میں تعریف مانع نہیں رہے گی، لیکن یہاں آپ کو دوبارہ اس حقیقت کو یاد کرنا چاہیے جو شروع میں قلم بند کی جا چکی ہے یعنی ادب بھی دیگر علوم کی طرح مفید طور پر وجود نہیں پا سکتا، جب تک ان علوم کا سہارا نہ لیا جائے جو ایک طرف اس کے معین و مددگار رہیں اور دوسری طرف پائیداری، ہمہ گیری اور گہری ثقافت کا آئینہ دار بھی۔

"تاریخ ادب، محض ادب کی تاریخ نہیں ہوتی بلکہ ادب کے ضمن میں ہر چیز کی تاریخ آپ کو اس میں مل جاتی ہے۔ مورخ ادبی تاریخ، سیاسیات و اقتصادیات سے اسی طرح بحث کرتا ہے جس طرح مورخ سیاسیات و اقتصادیات ادب کی تاریخ سے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سیاسیات کا

مؤرخ اصل بحث سیاسیات سے کرتا ہے اور سیاسیات کا سرسری تذکرہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ ادبی بحث کا تتمہ کر سکے۔ اس بحث کو ہم مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ادب اپنی ماہیت کے اعتبار سے وہی ہے جس کو ہم کلام منقول سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن اس کلامِ منقول کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا ادیب اس وقت تک متحمل نہیں ہو سکتا جب تک پائیدار اور ہمہ گیر ثقافت اور کچھ خاص خاص ضروری علوم کا سہارا نہ لے۔ تاریخ ادب ابتداً اسی کلامِ منقول اور کلام متعلقہ کی طرف توجہ کرتی ہے مگر فوراً مجبور ہو کر اسے اپنی بحث کا میدان وسیع کرنا پڑتا ہے اور ان چیزوں کو بھی اپنے دائرۂ بحث میں شامل کرنا پڑتا ہے۔"

اساسیاتِ اسلام

مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں اور کس حد تک ان سے فرد و معاشرے کے تقاضے پورے ہوتے ہیں، موجودہ دور کے غلط علمی رجحانات نے کن غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے اور اسلام کے نقطۂ نظر سے ان کا کیا جواب ہے؟ اسلام علوم و فنون کے ارتقا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور عقیدہ و عمل کے وہ کون سے خطوط ہیں جو انسانیت کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں؟

اساسیاتِ اسلام میں ان سوالات سے متعلق بڑے یقین پرور اور پُر اثر اسلوب میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں ان تمام مشکلات کا تسلی بخش حل پایا جاتا ہے، جن سے کہ آج نوعِ انسانی دوچار ہے۔

صفحات ۱۶ + ۲۸۴ قیمت -/۲۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور